دینی تعلیم اور عصری تقاضے

جناب پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق جامعہ ملیہ دھلی

دینی تعلیم کا مطلب ہے دین اور مسائل دین کی تعلیم' جو کچھ اور نہیں تو مفتی کفایت اللہ مرحوم کی تعلیم الاسلام یا مولانا تھانوی کی بہشتی زیور ہی کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اتنی ضروری تعلیم دیکھا جائے تو اس کا حصول امت کے ہر فرد کے لیے لازمی ہے۔ لیکن یہاں ہم جس دینی تعلیم سے بحث کر رہے ہیں ' اس کا مطلب ہے کتاب و سنت سے گہری واقفیت' اور فقہ اسلامی کی مکمل فہم و بصیرت' جسے حاصل کرنے کے لیے طلبہ کو عموماً" ابتدائی تعلیم کے بعد اپنی عمر کے بارہ پندرہ برس دینی تعلیم کی درسگاہوں میں گزارنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ایک طالب علم کہیں چوبیس پچیس برس کی عمر میں عالم بن پاتا ہے۔

آج برصغیر ہند و پاک میں تعلیم گاہیں "دینی" اور "دنیاوی" دو الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے سیاسی دور عروج میں طریق تعلیم اور نصاب تعلیم ان دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھا۔اس وقت صرف ایک ہی قسم کی تعلیم گاہیں ہوتی تھیں۔ جنہیں "مدرسہ" کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ مدرسہ کے ہر فارغ التحصیل کا شمار از خود طبقہ علما میں ہونے لگے۔ علما عام طور سے ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو مدرسے کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کی ذمہ داریاں سنبھالتے تھے یا حکومت کے شعبہ ہائے امور مذہبی و عدلیہ میں قاضی ' مفتی ' امام ' خطیب وغیرہ کی حیثیت سے ملازمت کر لیتے تھے۔ بقیہ لوگ جو تکمیل کے بعد کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر لیتے تھے ' انہیں ان کے پیشوں کی نسبت سے پہچانا جاتا تھا۔ غرض کہ اس وقت علما اور غیر علما میں مابہ الامتیاز شے نفس تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے بعد والی زندگی ہوتی تھی۔

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ایسٹ انڈیا کمپنی کی برکت سے ہندستان میں مدرسوں کے بالمقابل ایسے تعلیمی ادارے بھی وجود میں آنے لگ جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں اسکول اور کالج کہتے ہیں۔ یہ درسگاہیں عموماً" کسی نہ کسی عیسائی مشن کی نگرانی میں چلتی تھیں۔ مشن کے اسکول اگرچہ ترقی کی راہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھے تاہم کم از کم نصف صدی تک مدرسوں کی اہمیت میں کمی نہیں آنے پائی یونکہ اس وقت تک ان مدرسوں کے فارغین کو بھی سرکاری ملازمتوں کے لیے پورے طور سے اہل سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ہندستان کی برطانوی حکومت نے "اسکولوں" کے مقابلے میں "مدرسوں" کو نظر

انداز کرنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ حالات میں اس حد تک تبدیلی آگئی کہ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے سرکاری ملازمتوں میں معزز عہدے حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہو گیا۔ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ وہ ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کی پالیسی پر عمل کرتی رہی۔ ان حالات کے پیش نظر ہندستان کے مسلمانوں کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ انہیں اپنی دینی تعلیم کے لیے حکومت پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اگر وہ اپنی نئی نسل کو دائرہ اسلام کے اندر رکھنا چاہتے ہوں تو انہیں مدرسوں کو چلانے کے لیے خود اپنے وسائل پر بھروسا کرنا چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے آئندہ پیش آنے والے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کی غرض سے وہ اپنے ذاتی اور خود مختار مدرسے قائم کریں گے۔ اس لیے ان اداروں کے انتظامی امور میں سرکاری مداخلت کے پیش نظر انہوں نے سرکاری امداد کو ایک طرح سے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا۔

مندرجہ بالا خطوط پر ہندستان میں قائم ہونے والا ' بلکہ دیکھا جائے تو پوری دنیا میں قائم ہونے والا سب سے پہلا مدرسہ دیو بند کا دارالعلوم تھا جو ۱۸۶۵ میں وجود میں آیا۔ اور اس کا نام اس کے ایک بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام پر مدرسہ قاسم العلوم رکھا گیا' لیکن اب وہ دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ بانیان دارالعلوم دیوبند کے ذہن میں شروع ہی سے یہ تجویز تھی کہ پورے ملک میں نہیں تو کم از کم شمالی ہندستان میں ایسے مدارس کا ایک جال سا بچھادیا جائے جو دارالعلوم دیوبند سے الحاق رکھتے ہوں۔ اس خیال کے تحت ۱۸۶۵ ہی میں سہارن پور میں مدرسہ مظاہر العلوم کا اور ۱۸۷۸ میں مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ جس مفہوم میں ہم آج کل کالجوں اور اسکولوں کے بارے میں الحاق کا لفظ بولتے ہیں' اس مفہوم میں مذکورہ بالا دونوں مدرسے یا ان کے بعد قائم ہونے والے مدرسے دارالعلوم دیوبند سے نہ آج ملحقہ ہیں اور نہ کبھی پہلے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اگرچہ ہندستان کے کم و بیش تمام دینی مدارس تقریباً" ایک ہی قسم کا نصاب تعلیم پڑھاتے ہیں ' لیکن وہ اپنے تعلیمی یا انتظامی معاملات میں کسی مرکزی ہیئت تعلیمی کے ماتحت نہیں ہوتے۔

آج ہندستان کا ---- اور اگر میری معلومات صحیح ہیں تو پاکستان کا بھی ------- ہر مدرسہ اپنے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد 'اپنی تعلیمی کارگزاریوں اور اپنے سالانہ بجٹ کا لحاظ کیے بغیر اپنے کو علوم اسلامیہ کی یونیورسٹی نہیں تو کم از کم کالج ضرور ہی سمجھتا ہے۔ ملک کے تمام دینی

مدارس خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے' نصاب اور طریق تعلیم و تربیت میں یکسانیت کے باوجود' اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے بڑے حکومت سے امداد نہیں لیتے' اور چھوٹوں کو ملتی نہیں' چونکہ ان کی زندگی کا دار و مدار مسلمانوں کے دیے ہوئے منقولہ اور غیر منقولہ عطیات اور چندوں پر ہوتا ہے' اس لئے یہ تمام مدارس کسی نہ کسی نام سے انتہائی دینی تعلیم کا نصاب اپنے یہاں ضرور رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر انہیں قوم سے معتدبہ چندہ نہیں مل سکتا۔ نتیجتاً" جس علاقے میں صرف دو ایک ثانوی مرحلے تک کے مدرسوں سے کام چل سکتا ہے وہاں بلا ضرورت درجنوں چھوٹے بڑے مدرسے قائم ہوتے ہیں اور ایک طرح سے قومی دولت کے ضائع کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی بالادستی ختم ہو جانے کے بعد جب ملک کی سرکاری تعلیم گاہوں کے بالمقابل اس زمانے کے صاحب بصیرت علما نے حکومت سے بے تعلق آزاد دینی مدارس کے قیام کا تصور پیش کیا تھا تو ان کے نزدیک بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ دینی اور دنیاوی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والے لوگ مہیا کیے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دینی مدارس ایک طرح سے "مسلم قیادت" کی تربیت گاہوں کی حیثیت سے شروع کیے گئے تھے۔ دینی تعلیم کے مدارس کے قیام کی اس بنیادی غرض و غایت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم یہ سوال کریں کہ کیا ہمارے موجودہ مدارس اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں تو جواب غالباً" بہت زیادہ خوش آیند نہ ہوگا۔ ایسا کیوں ہے' اس کی تفصیل میں یہاں نہیں جایا جاسکتا' لیکن ہے یہ امر واقعہ کہ ہماری دینی تعلیم کے نظام میں کہیں کوئی ایسی جھول آگئی ہے جس کی وجہ سے چول پر چول نہیں بیٹھ پاتی۔ الزام ہم خواہ نصاب کے سر دیں' خواہ نظام کے سر' نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے "قائد گری" کے جو کارخانے قائم کیے تھے ان سے "فرمائشی مال" ضرورت کے مطابق باہر نہیں آرہا۔ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ہمارے مدارس بھی "انخلائے ذہن" (BRAIN DRAIN) کی مصیبت کا شکار ہو چکے ہیں' اور اس معاملے میں صورت حال یہ ہے کہ جو مدرسہ جتنا زیادہ اہم ہے اسے اتنا ہی زیادہ مصیبت کا سامنا ہے۔

چونکہ ہندستان کی کی ہیئت تعلیمی میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری طور پر "سند یافتہ" نہیں سمجھا جاتا اس لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بالعموم بند ہوتے ہیں۔ پرائیوٹ فرموں اور صنعتی اداروں میں جگہ حاصل کرنے کے لیے جس صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہے وہ ان میں ہوتی نہیں۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ کچھ دنوں کی کشاکش روزگار کے بعد ان میں سے کچھ لوگ تو ملک کی چند گنی چنی اہم اور وقیع دینی درسگاہوں میں ناقابل ذکر

مشاہروں پر درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگتے ہیں ' کچھ لوگوں کو ملک میں خود رو پودوں کی طرح اگے ہوئے نام نہاد دینی مدارس میں جگہ مل جاتی ہے۔ کچھ لوگ مسجدوں میں امامت شروع کر دیتے ہیں ' جہاں وہ امامت کے ساتھ ساتھ محلے کے بچوں کو قرآن شریف اور ابتدائی دینیات کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہل کرم بھی دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کی غرض سے طبیہ کالجوں میں داخلے لیتے ہیں اگرچہ اب طبیہ کالجوں میں داخلہ ملنا بھی کچھ آسان نہیں رہ گیا ہے کیونکہ ان کالجوں میں بھی اب سائنس اور جدید علم العلاج پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زور دیا جانے لگا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ایک مدرسہ قائم کر کے بیٹھ جاتے ہیں ۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا۔ چونکہ دینی مدارس کے لیے الحاق کا کوئی سوال نہیں ہے 'اور نہ ہی حکومت کے محکمہ تعلیم سے مدرسے کھولنے کے لیے کبھی اجازت لینے کی ضرورت پڑتی ہے' اس لیے ہر وہ شخص مدرسہ کھول سکتا ہے جس میں لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکلوا لینے کی صلاحیت ہو۔

یہ تھیں وہ چند صورتیں ' جنہیں ابھی کچھ دنوں پہلے تک دینی مدارس کے طلبہ تکمیل تعلیم کے بعد اپناتے تھے۔ ان میں سے آمدنی کے لحاظ سے کوئی صورت بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم معیاری اور مثالی کہہ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام صورتوں میں عالم کی اپنی حیثیت باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اب کچھ دنوں سے ایک نئی صورت حال کا سامنا ہے۔ اگر ہم مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان کی ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پر مختلف خانوں میں بانٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ یہ لوگ تکمیل تعلیم کے بعد کدھر کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں تین سطح نظر آئیں گی۔ ارباب مدارس میری اس بات کی تائید کریں گے کہ ان کے فارغین میں سے اوپری سطح کے لڑکے مدرسہ کے ساتھ ساتھ ملک کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں ۔ عرب ممالک کی خیر ہو کہ اب دینی مدارس کے اچھے طلبہ کو وہاں پر معقول وظائف مل جاتے ہیں اور وہ اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کو دو ایک برس وہاں کے اساتذہ کے سامنے دھرا لینے کے معاوضہ میں گرانقدر مشاہروں پر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد "عالم" کی حیثیت سے اگر ان کا وجود باقی رہ بھی جائے۔ جس کا یقین کم ہی ہے۔ تو بھی ان کے اپنے ملک کے لوگ ان کی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے قائد سے ہمارا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔

دوسری سطح پر وہ ذہین طلبہ نظر آتے ہیں جو تکمیل کے بعد مکہ اور مدینہ کی یونیورسٹیوں میں تو جگہ نہیں پاتے' لیکن خود ان کے اپنے ملک کی بعض یونیورسٹیاں انہیں خوش آمدید کہتی ہیں۔ ہندستان میں بعض یونیورسٹیاں ایسی ہیں ---- اور پاکستان میں تو غالباً" سب ہی ہونگی جو

گنے چنے دینی مدارس کی سندوں کو جامعاتی تعلیم کے لیے تسلیم کرتی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں جس قسم کے طلبہ آتے ہیں ان کے مقابلے میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اپنی نمایاں شخصیت کے باعث تقریباً ہر میدان میں آگے آجاتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ یونیورسٹیوں کی فضا میں آہستہ آہستہ ایک خوشگوار تبدیلی تو آسکتی ہے بشرطیکہ ایسے طلبہ کان نمک میں جاکر نمک نہ بن جانے کا تہیہ کرلیں، لیکن دینی مدارس کی تہی دامنی میں روز بروز اضافہ ہونے جانے کا امکان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ بہرحال یہ طلبہ بھی جدید درسگاہوں میں آجانے کے بعد صاحب علم تو رہتے ہیں، لیکن ان کی عالم کی حیثیت باقی نہیں رہ پاتی۔

اوپر کی دونوں سطحوں کے ہٹ جانے کے بعد تیسری سطح پر جو طالب علم بچتے ہیں --- اور انہیں میں بھاری اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ملک یا ملک کے باہر کی یونیورسٹیوں میں اپنی جگہ بنا پاتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مسند عالمیت پر متمکن ہوتے ہیں اور انہیں کے ہاتھوں میں دینی قیادت ہوتی ہے۔ یہی لوگ دینی مدارس میں اپنے اساتذہ کی خالی جگہوں کو پر کرتے ہیں اور یہی لوگ مستقبل کے قائد بنانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

انحلائے ذہن کی مصیبت سے تو پوری دنیا دوچار ہے، اس کا علاج دینی مدارس کے پاس ہے نہ دنیاوی مدارس کے پاس۔ یہ تو ایک ایسی مصیبت ہے جس پر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اندرون ملک جو انحلائے ذہن ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے ارباب مدارس کو آج نہیں تو کل غور کرنا پڑے گا۔ اور یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ خود اپنے نصاب اور نظام تعلیم کو ایسا بنایا جائے کہ اس کی تکمیل کے بعد طالب علم کو کسی دوسرے ادارے کا رخ کرنے کی ضرورت نہ پڑے، یا پھر ماضی کے ورثے کو متاع عزیز سمجھ کر اس طرح کلیجے سے لگائے رہا جائے کہ مستقبل سے رشتہ ہی کٹ جائے۔ موجودہ صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے مدارس کی ایک فہرست تیار کی جائے، پھر دینی تعلیم کو منظم کرنے کے لیے مدارس کی ایک ہیئت مرکزی قائم کی جائے جس سے ہر مدرسے کا الحاق ضروری ہو۔ تمام عطیات اور چندے براہ راست مدارس کو دینے کے بجائے اس ہیئت مرکزی کو دیے جائیں۔ عمومی چندوں اور عطیات کے علاوہ اس ہیئت مرکزی کی آمدنی کا ایک دوسرا بڑا ذریعہ مسلم اوقاف کو بنایا جاسکتا ہے۔ تمام ریاستیں اور مرکزی وقف بورڈوں کی آمدنی کا ایک حصہ اس ہیئت مرکزی کے لیے نامزد کرایا جانا چاہیے۔ اس طرح تمام رقوم کو یکجا کرلینے کے بعد یہ ہیئت مرکزی اپنے ممبر مدرسوں میں طلبہ کی تعداد اور ان کی دوسری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے سالانہ گرانٹ کی شکل میں رقم تقسیم کرے اور اس کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتی رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ تمام مدرسوں کی نئی درجہ بندی کی جائے۔ کچھ مدرسے صرف ابتدائی دینی تعلیم کے ہوں۔ کچھ ثانوی تعلیم کے مرحلہ تک کے مدرسے ہوں۔ پورے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے مدارس صرف چند ایک ہونے چاہیں۔ ہر لڑکے کو اس کے رجحان کا خیال کیے بغیر آنکھیں بند کر کے اعلیٰ تعلیم کے مدرسوں میں داخلہ نہ دیا جائے۔ ابتدائی دینی تعلیم کے بعد جن طلبہ کے بارے میں اندازہ ہو کہ ان میں "عالمیت" کا بار اٹھانے کی صلاحیت ہے' انہیں ثانوی مدارس میں داخلہ دیا جائے' بقیہ کو ان کے رجحان کا اندازہ کر کے صنعتی علوم یا سماجی علوم کے مدارس میں داخلہ لینے کے لیے کہا جائے۔ دینی تعلیم کے ثانوی مدارس سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کا ایک بار پھر جائزہ لیا جائے۔ جو طالب علم اعلیٰ دینی تعلیم کے مدارس میں جگہ دیے جانے کے قابل نہ ہوں انہیں اس مرحلے پر روک دیا جائے۔ ثانوی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے سپرد مسجدوں کی امامت کی جائے۔ کیونکہ اس مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد وہ ان تمام ضروری مسائل سے کما حقہ واقفیت حاصل کر چکے ہونگے جن کی ضرورت انہیں بحیثیت امام کے پڑے گی۔ یہ امام صرف پنج وقتہ نمازوں کے ہی امام نہ ہونگے بلکہ اپنے محلّہ کی دینی اور تعلیمی زندگی کے بھی نگراں ہونے۔ ان کی تنخواہوں کے شریفانہ گریڈ ہوں اور تنخواہ محلوں کے چودہریوں کے ہاتھوں سے ملنے کے بجائے براہ راست ہیئت مرکزی سے ملے تاکہ ان کی عزت نفس باقی رہ سکے اور ہر مقتدی اپنے کو اماموں کا امام نہ سمجھے۔

ثانوی مرحلے کے بعد جو طالب علم اعلیٰ تعلیم کے مدرسوں میں بھیجے جائیں ان کے لئے ایک ایسا نصاب ہو جو دین کے تمام ضروری علوم پر حاوی ہو۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ ضروری دنیاوی علوم کی مبادیات اور خاص طور سے ملک اور بیرون ملک کی دو ایک اہم زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ طلبہ کو جدید طریق تحقیق سے آگاہ کرایا جائے۔ ایسے مواقع مہیا کیے جائیں کہ وہ مستشرقین کے کارناموں سے براہ راست واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں ایسے کورس رائج کیے جائیں جن کی مدد سے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کے طلبہ مستشرقین کو کم از کم انگریزی میں تو ضرور ہی براہ راست پڑھ سکیں اور خود سے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

اس مرحلے پر "تقابلی فقہ اسلامی" کے مطالعے پر بھی زور دیا جائے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک فقہی مسلک سے تعلق رکھنے والے عالم کو دوسرے فقہی مسلک سے براہ راست واقفیت نہیں ہوتی۔ اپنے مسلک کے علاوہ دوسرے مسلکوں سے انہیں صرف اس قدر واقفیت ہوتی ہے جتنی اپنی مسلک کی بالا دستی کے ثبوت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہونا یہ چاہیے کہ عالم کی نظر دوسرے فقہی مسلکوں پر بھی اتنی ہی گہری ہو جتنی کہ خود اس

کے اپنے مسلک پر ہونی چاہیے۔دوسرے مسالک کا مطالعہ اس غرض سے نہ کیا جائے کہ اس پر اپنے مسلک کی بالادستی ثابت کرنی ہے، بلکہ اس خیال سے مطالعہ کرنا چاہیے کہ مجتہد کے لیے دوسرے فقہی مسالک کا علم بھی بہت ضروری ہے۔تقابلی مطالعے کے سلسلے میں کسی زمانے میں یہ عام غلط فہمی تھی کہ اس میں دو مسلکوں کا باہمی مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس طرح اونچ نیچ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ صحیح تقابلی مطالعہ یہ ہے کہ طالب علم دوسروں کے مسلک کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھے کہ اگر وہ خود اس مسلک سے تعلق رکھتا ہوتا تو اس کا نقطۂ نظر مسائل زیر بحث میں کیا ہوتا۔ دراصل تقابلی مطالعہ اگر ایک طرف علم کا مطالعہ ہے تو دوسری طرف ان اشخاص کی نفسیات کا بھی مطالعہ ہے جن کا اس مسلک سے تعلق ہوتا ہے۔

غرضیکہ اگر ہم اس پوری بحث کو سمیٹنا چاہیں تو مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ مختلف تعلیمی مرحلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دینی مدارس کی درجہ بندی کی جائے اور انہیں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز میں تقسیم کیا جائے۔

۲۔ ایک ایسی ہیئت مرکزی قائم کی جائے جس سے تمام مدارس کا الحاق ضروری ہو۔

۳۔ مدارس کو انفرادی طور پر چندہ دینے کے بجائے تمام عطیات ہیئت مرکزی کو دے جائیں اور وہاں سے مدارس کو گرانٹ کے طور پر ضروری امداد دی جائے۔

۴۔ عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے نصاب تعلیم کو خود کفیل بنایا جائے ۔ طلبہ کو انگریزی اور کم از کم کسی ایک علاقائی زبان سے اچھی طرح واقف کرایا جائے۔

۵۔ اعلیٰ درجات میں طلبہ کو تقابلی فقہ اسلامی سے روشناس کرایا جائے۔

اس سب کے باوجود خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا جائے کہ اس کی مدد کے بغیر ہم صرف ہوائی باتیں ہی کرسکتے ہیں ۔انجام اس کے ہاتھ میں ہے۔

(ماخوذ از مقالات مذاکرہ ملی (ہمدرد)

گھر بیٹھے عربی سیکھئے
آپ قرآن و حدیث سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہوں یا عرب ممالک جا کر معقول مشاہرہ پر ملازمت۔ آپکو پیارے نبیؐ کی پیاری زبان عربی سیکھنی چاہیے ... ہم آپ کو چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں گھر بیٹھے بذریعہ خط و کتابت ... ۳۰ منٹ میں مکمل عربی مع گرامر نہایت سہل انداز سے سکھائیں
مزید تفصیلات ۱۰۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں
پتہ: ادارہ فروغ عربی پاکستان
شلائٹ ٹاؤن میر پور خاص سندھ

خط و کتابت کورسز
اپنی نوعیت کے دو منفرد خط و کتابت کورسز میں داخلہ جاری ہے
۱۔ قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
پر مبنی کورس جو بذریعہ کیسٹس کرایا جاتا ہے
۲۔ عربی گرامر خط و کتابت کورس
جس میں عربی گرامر جدید خطوط پر پڑھائی جاتی ہے
داخلہ
کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس اور دیگر تفصیلات کے لئے درج ذیل پتہ پر رابطہ کریں
شعبۂ خط و کتابت کورس
قرآن کالج ۱۹۱-A، اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۵۴۶۰۰
فون: ۸-۸۳۳۶۳۷